برف کی ناؤ
مظفرؔ وارثی

جدید اردو غزل میں مظفر وارثی کا لہجہ منفرد ہے
اس نے حقیقت اور صداقت کا جو اسلوب پسند کیا ہے وہ
غزل کے نئے اور شاداب امکانات کی نشاندھی کرتا ہے۔

وہ اردو کے ان چند جدید غزل نگاروں میں شامل ہے
جنہوں نے جدت کو محض جدت کی خاطر اختیار نہیں کیا
بلکہ اس سے غزل میں نکھار، تازگی اور توانائی پیدا کی ہے۔
لفظوں کے نئے آہنگ کے ساتھ ان کے بلیغ استعمال پر اسے
قدرت حاصل ہے۔ وہ نئی علامتیں تخلیق کرتا ہے نئی تراکیب
ڈھالتا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ نئے مسائل پر۔ اپنے
عصر کے مسائل پر غور کرتا ہے اس نے غزل کے معینہ
مضامین کے حلقے کو توڑنے کے بعد نئے مضامین غزل میں
داخل کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا
کہ وہ حسن کار ہے اور اب ایسے ہی طرز اظہار اور طرز
فکر کے ساتھ اردو غزل کا مستقبل وابستہ ہے۔

احمد ندیم قاسمی

سرورق ! مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی

مظفّر وارثی

برف کی ناؤ

نیو ایج پبلی کیشنز
رضا روڈ ۱۱ - شاہ کمال کالونی - لاہور

ناشر	شریف احمد صدیقی
مطبع	المکتہ پریس لاہور
سرورق	عبدالرحمٰن چغتائی
کتابت	محمد حسین (شاہ)
تعداد	۱۱۰۰
قیمت	آٹھ روپے ۸/-

والدِ گرامی علامہ صوفی وارثی کے نام

جنھوں نے

اپنی بصیرت اور اپنا شعور بھی میرے نام کر دیا

ڈوب کر دیکھ سمندر ہوں میں آوازوں کا

طالبِ حسنِ سماعت مرا سناٹا ہے

ترتیب

پہلی بات

میرا فن مجھ میں اُس پرندے کی طرح جاگا جو سورج کی کرنوں کو اپنے پروں سے کاٹتا ہوا اُڑتا ہے۔ تندیٔ فکر نے بلندیوں پر بھی اُچھالا مگر زمین کی کشش نے میرے قدموں کو جکڑے رکھا۔ موجِ خیال گہرائیوں میں بھی لے گئی۔ لیکن ہاتھ پانی سے اُوپر ہے۔
یہ میرے وجدان کے شعلے ہیں جو الفاظ کی ہر یالیوں میں روشن ہیں اور یہ چمکتی شادابیاں کھُلی فضاؤں کے سپرد کر رہا ہوں۔

[signature]

○

نکھر سکا نہ بدن چاندنی میں سونے سے
سحر ہوئی تو خراشیں تھیں بچھونے سے

صدف لیے ہوئے اُبھری ہے لاش بھی میری
بچا رہے تھے مجھے لوگ غرق ہونے سے

ہُنر ہے تجھ میں تو قائل بھی کر زمانے کو
چمک اُٹھے گی نہ شکل آئینے کو دھونے سے

لپٹ رہی ہیں مرے راستوں سے روشنیاں
نظر میں لوگ ہیں کچھ سانولے سلونے سے

لگا کے زخم بہانے چلا ہے اب آنسو
رُکا ہے خون کہیں پٹیاں بھگونے سے

ہمیں نہ ہوں کہیں دیکھو تو غور سے لوگو
ہیں طفلِ وقت کے ہاتھوں میں کچھ کھلونے سے

مرے دکھوں سے بھی کچھ فائدہ اُٹھا دُنیا
زمیں کی پیاس بجھے بادلوں کے رونے سے

لہو، رگوں میں مظفؔر چھڑائے مہتابی
ملے ہے کیا اسے چنگاریاں چبھونے سے

○

لبِ خاموش سے اظہارِ تمنّا چاہیں
بات کرنے کو بھی تصویر کا لہجہ چاہیں

تُو چلے ساتھ تو آہٹ بھی نہ آئے اپنی
درمیاں ہم بھی نہ ہوں یوں تجھے تنہا چاہیں

ظاہری آنکھ سے کیا دیکھ سکے گا کوئی
اپنے باطن پہ بھی ہم فاش نہ ہونا چاہیں

جسم پوشی کو ملے چادرِ افلاک ہمیں،
سر چھپانے کے لیے وسعتِ صحرا چاہیں

خواب میں روئیں تو احساس ہو سیرابی کا
ریت پر سوئیں مگر آنکھ میں دریا چاہیں

بھینٹ چڑھ جاؤں نہ میں اپنے ہی خیر و شر کی
خونِ دل ضبط کرے زخمِ تماشا چاہیں

زندگی آنکھ سے اوجھل ہو مگر ختم نہ ہو
اک جہاں اور پسِ پردۂ دنیا چاہیں

آج کا دن تو چلو کٹ گیا جیسے بھی کٹا
اب خداوند سے خیریّتِ فردا چاہیں

ایسے تیراک بھی دیکھے ہیں مظفرؔ ہم نے
غرق ہونے کے لیے بھی جو سہارا چاہیں

○

یہ کون خاک نشیں تیری رہ گزر سے اُٹھا
چلا زمین کے اُوپر، غبار سر سے اُٹھا

کھنگالتا رہا گہرائیاں سمندر کی
ڈبو گیا مجھے، طوفاں جو چشمِ تر سے اُٹھا

چراغ بوئے کہ پھوٹیں زمیں سے روشنیاں
ہری ہُوئیں جب امیدیں دھواں شجر سے اُٹھا

چبھن کچھ ایسی بھری تھی حسین خوابوں نے
میں آنکھ ملتا ہُوا بسترِ سحر سے اُٹھا

مری حدود سے باہر نہ جا سکے تو بھی
بنا کے تو مجھے دیوار، اپنے در سے اُٹھا

نہوں ہیں کیسے ہم اک دوسرے کو پہچانیں
نقابِ حسن سے، پردہ مری نظر سے اُٹھا

پُکارا رہا تھا تجھے جاگ اُٹھے در و دیوار
نقب لگائی ترے دل میں شور گھر سے اُٹھا

قرارِ جاں کی مظفؔر کو جستجو ہی رہی
کبھی بگولے سے نکلا کبھی بھنور سے اُٹھا

○

اُتنا ہی سایہ ہے جتنی روشنی پردے پہ ہے
میں ہوں دھندلایا ہوا یا گرد آئینے پہ ہے

رقص کرتی ہیں نئی رسمیں مرے تابوت پر
میرے زخموں کا لہو تہذیب کے ماتھے پہ ہے

یہ اگر سچ ہے کہ میں بھی آپ لوگوں میں سے ہوں
جھوٹ ہے یہ بھی کہ مجھ کو اعتماد اپنے پہ ہے

رہن رکھ دی بے حسی کے پاس کیا آواز بھی
بولتا کوئی نہیں، الزام سناٹے پہ ہے

کس طرح آؤں چمکتے منظروں کے سامنے
داغِ بینائی ہو جیسے، آنکھ یوں چہرے پہ ہے

اب مسافر میں نہیں، کرتا ہے طے مجھ کو سفر
چل رہا ہوں خاک پر، نقشِ قدم سینے پہ ہے

ہو مظفرؔ جانے کب بیتے دنوں کی واپسی
بس گزرتی ساعتوں کی چاپ دروازے پہ ہے

○

سایا کوئی میں اپنے ہی پیکر سے نکالوں
تنہائی بتا کیسے تجھے گھر سے نکالوں

اک موج بھی مل جائے اگر مجھ کو صلے میں
گرتے ہُوئے دریا کو سمندر سے نکالوں

تیشے سے بجاتا پھروں میں بربطِ کہسار!
نغمے جو مرے دل میں ہیں پتّھر سے نکالوں

لَو تیز نہیں کچھ مری آنکھوں ہی کی شاید
مطلب یہی بے نوریٔ منظر سے نکالوں

بدلے نہ کوئی رنگ، ترا حسنِ خموشی
میں بات کے پہلو ترے تیور سے نکالوں

توبہ نے جگایا مرے اندر کا شرابی
اب فال بھی ٹوٹے ہُوئے ساغر سے نکالوں

سوچوں کے بیاباں میں لیے پھرتا ہے مجھ کو
کیا ذہن بھی سودا ہے جسے سر سے نکالوں

اک نسلِ سخن مجھ میں ہے آباد مظفرؔ
صورت نئی ہر لفظ کے اندر سے نکالوں

○

قبائے گل بھی اگر میرے پیرہن سے ملے
مزاج کیوں نہ مرا نکہتِ چمن سے ملے

شگفتگی کو ضرورت نہیں منادی کی
خبر بہار کی ، چہروں کے بانکپن سے ملے

جلائے شام ، دیے رُو پہ آبشاروں کی
سماں زمیں کا ، ستاروں کی انجمن سے ملے

کھُلی فضا کے قصیدے لکھوں ہواؤں پہ
اگر نجات مجھے ذہن کی گھٹن سے ملے

وہ آنکھ ہو جسے جھپکا سکے نہ سورج بھی
وہ گرم دل ہو کہ ٹھنڈک جسے کرن سے ملے

مری فراخدلی کا ثبوت دنیا کو
جبینِ وقت پہ مٹتی ہوئی شکن سے ملے

اٹھائیں ہاتھ میں شاعر بھی اب قلم ایسا
کہ پرچموں کی علامت جسے کفن سے ملے

طبیعتوں کو روانی، لبوں کو گویائی
عجب نہیں ہے مظفرؔ مرے سخن سے ملے

O

مرہم زخم سے مجھے دل پہ لگانے کو دیا

میں نے کچھ بھی تو نہ بدلے میں زمانے کو دیا

تیری آواز ہر اک حرف سے سننے کے لیے

رنگ ہونٹوں کا ترے، اپنے فسانے کو دیا

دلِ حساس کی گٹھڑی مرے سر پر رکھ دی

زندگی تو نے بہت بوجھ اُٹھانے کو دیا

تم یہ کہتے ہو کہ روشن ہے مرا مستقبل

اور مرے پاس نہیں گھر میں جلانے کو "دیا"

کسی مخلوق کو اہل اس کا نہ سمجھا تُو نے

غمِ ہستی فقط آدم کے گھرانے کو دیا

ہمسفر بھی نہ ہُوا میرا مظفر کوئی

چل پڑا تنہا تو رستہ بھی نہ جانے کو دیا

○

میری تصویر میں رنگ اور کسی کا تو نہیں
گھیر لیں مجھ کو سب آنکھیں، میں تماشا تو نہیں

زندگی تجھ سے ہر اک سانس پہ سمجھوتہ کروں
شوق جینے کا ہے مجھ کو مگر اتنا تو نہیں

چہرہ دیکھوں تو خد و خال بدل جاتے ہیں
چھپ کے آئینے کے پیچھے کوئی بیٹھا تو نہیں

کس کی مٹی کو نچاتے ہیں ہواؤں کے بھنور
کوئی آوارۂ وحشت ہے بگولا تو نہیں

روح کو درد ملا درد کو آنکھیں نہ ملیں
تجھ کو محسوس کیا ہے تجھے دیکھا تو نہیں

میری آنکھوں میں ترے نقشِ قدم کیسے ہیں
اس سرائے میں مسافر کوئی ٹھہرا تو نہیں

سوچتے سوچتے دل ڈوبتے لگتا ہے مرا
ذہن کی تہ میں مظفرؔ کوئی دریا تو نہیں

○

جی بہلتا ہی نہیں سانس کی جھنکاروں سے
پھوڑ لوں سر نہ کہیں جسم کی دیواروں سے

اپنے رِستے ہوئے زخموں پہ چھڑک لیتا ہوں
راکھ جھڑتی ہے جو احساس کے انگاروں سے

گیت گاؤں تو لپک جاتے ہیں شعلے دل میں
ساز چھیڑوں تو نکلتا ہے دھواں تاروں سے

کاسۂ سر لیے پھرتی ہیں وفائیں اب بھی
اب بھی تیشوں کی صدا آتی ہے کہساروں سے

زندہ لاشیں بھی دکانوں میں سجی ہیں شاید
بُوئے خوں آتی ہے کُھلتے ہوئے بازاروں سے

کیا مرے عکس میں چھپ جائیں گے ان کے چہرے
اتنا پوچھے کوئی ان آئنہ برداروں سے

پیار ہر چند جھلکتا ہے اُن آنکھوں سے مگر
زخم بھرتے ہیں مظفرؔ کہیں تلواروں سے

○

کہو جو کہنا ہے تم کو، مری زباں بھی کھُلے
برس چکیں یہ گھٹائیں تو آسماں بھی کھُلے

لگا ہوں پار کلائی پکڑ کے لہروں کی
بہے قدم تو ہواؤں کے بادباں بھی کھُلے

ترے قریب اُنھیں سے گزر کے آیا ہوں
جو در کھلی ہُوئی آنکھوں کے درمیاں بھی کھُلے

جمے نہ خاک بھی میری فضا کے چہرے پر
ہوائیں تیز ہوں، مُٹھی مری جہاں بھی کھُلے

چمکتی دھوپ، اُڑتا غبار، خشک شجر
تنے ہُوئے ہیں مرے سر پہ سائباں بھی کھُلے

کیا ہے قید مظفرؔ سکوت نے مجھکو
سنائی دے کوئی آہٹ تو بابِ جاں بھی کھُلے

○

کتنا اُونچا پستیوں سے اپنی ٹکرا کر گرا
خاک نے مجھ کو اُچھالا تو ستاروں پر گرا

زندگی نے بڑھ کے سینے سے لگایا تھا مجھے
ہاتھ میں آئی جب اُس کی آستیں، خنجر گرا

غم کے نازک دَور میں آنسو بھی ٹپکا ہے اگر
یوں ہُوا محسوس جیسے آنکھ سے پتھر گرا

دیتا آیا ہے خدا کو بھی یہ انساں رشوتیں
جب زمانے کی لگی ٹھوکر، مصلّے پر گرا

میری غیرت کو مظفؔر آزمانے کے لیے
جل اُٹھیں کعبے کی دیواریں خدا کا گھر گرا

○

عریاں بھلا ، لباسِ تمنّا اُتار دے
یہ طوق ہے اَنا کے گلے کا، اُتار دے

لہجہ بدل کہ بدلی ہُوئی ہیں سماعتیں
اے میری روح ، جسم پہ انا اُتار دے

شوقِ پیمبری ہے یہاں سب کو اے خدا
ہر آدمی پہ ایک صحیفہ اُتار دے

چلتی ہے میرا ہاتھ جھٹک کر ہر ایک موج
ممکن نہیں کہ پار یہ دریا اُتار دے

جھونکا بھی میں ہوا کا ہوں، جلتا چراغ بھی
خوشبو اُڑا، کہ جسم سے سایا اُتار دے

جو تجھ میں ڈوب جائیں وہ آنکھیں تلاش کر
تو جس میں چھپ گیا ہے وہ چہرہ اُتار دے

احسانِ زندگی نہ مظفرؔ اُٹھائے جا
آخر یہ بوجھ، سر ہی نہ تیرا اُتار دے

○

زندگی جس پر ہنسے ایسی کوئی خواہش نہ کی
گھاؤ سینے میں سجائے گھر کی آرائش نہ کی

نکتہ چینی پر مری تم اتنے برگشتہ نہ ہو
کہہ دیا جو کچھ بھی دل میں تھا، مگر سازش نہ کی

ایک سے حالات آئے ہیں نظر ہر دور میں
رُک گئے میرے قدم یا وقت نے گردش نہ کی

جھک گیا قدموں پہ تیرے پھر بھی سر اُونچا رہا
آنکھ پتّھر ہو گئی جلووں کی فرمائش نہ کی

لاکھ نظروں کو اُچھالا، تُو نہ آیا بام پر
سائے سر پٹخا کیے دیوار نے جنبش نہ کی

میں نے جن آنکھوں کو سینے میں اُتارا، پھر گئیں
خود کو اپنانے کی اِس ڈر سے کبھی کوشش نہ کی

رہ کے محدودِ وسائل کی مظفرؔ نے بسر
پاؤں پھیلا کر کبھی چادر کی پیمائش نہ کی

○

آشفتہ سری دشت میں کیا لے گئی مجھ کو
چل نکلا ، جدھر لغزشِ پا لے گئی مجھ کو

میں ذہن کے ساحل پہ کھڑا سوچ رہا تھا
اک موج اُٹھی اور بہا لے گئی مجھ کو

پہچان گئی تیز ہوا خاک بھی میری
پہنا کے بگولوں کی قبا ، لے گئی مجھ کو

خوشبو کی طرح سینۂ احساس میں گم تھا
اُٹھی وہ نظریوں کہ چرا لے گئی مجھ کو

بیٹھا تھا سرِ راہ گزر دھیان لگائے
اک چاپ سی قدموں کی بلا لے گئی مجھ کو

گزرا جو میں اک قافلۂ رنگ کی صورت
صحرا کی کڑی دھوپ اُڑا لے گئی مجھ کو

خود سے بہت آگے نکل آیا ہوں مظفرؔ
مجھ سے بھی پرے میری صدا لے گئی مجھ کو

○

جاگتے میں بھی ہمیں احساسِ بیداری نہیں
ہم ہیں اُس زنداں میں جس کی چار دیواری نہیں

تو مہکتے خواب مانگے ہیں چمکتے زخم دوں
قیمتی پتھّر ہیں میرے پاس پھلواری نہیں

کیوں مجھے ہر سانس پر ٹُوٹے طوائف کی طرح
زندگی عزّت سے بڑھ کر تو مجھے پیاری نہیں

جگمگاتی راہ اندر کے اندھیروں کو دکھا
ہاتھ میں مشعل ہے اور سینے میں چنگاری نہیں

اب تو ہر چہرے پہ چاہت کی دکانیں کھل گئیں
کتنے کم قیمت ہیں دل پھر بھی خریداری نہیں

چھُو کے جھونکا بھی گزرتا ہے تو ہِل جاتا ہے دل
ہوں تو میں پتھر مگر اپنی جگہ بھاری نہیں

آبِ زر کیسا، خیالوں میں چمک ہے ذہن کی
میں مظفرؔ آج کا شاعر ہوں درباری نہیں

○

تجھ سے بڑھ کر شبِ تنہائی وفادار لگے
اپنی پرچھائیں بھی مجھ کو تری دیوار لگے

بانٹ دیتا ہوں فضاؤں کو میں سینے کی گھٹن
سننے والوں کو مری آہ بھی جھنکار لگے

پاؤں زخمی ہوں تو آتی ہے چمک آنکھوں میں
اُسی رستے سے گزرتا ہوں جو دشوار لگے

موسمِ حبس بھلا دادِ سفر کیا دے گا
تیز جھونکے ہوں تو اندازۂ رفتار لگے

بیچتا ہوں تو دل و جاں، نہیں لیتا کوئی
دیکھتا ہوں تو ہر اک ہاتھ خریدار لگے

شعر کہتے ہوئے یوں ذہن تڑپ اُٹھتا ہے
جس طرح سر میں مظفرؔ کوئی تلوار لگے

○

کیا بھلا مجھ کو پرکھنے کا نتیجہ نکلا
زخمِ دل آپ کی نظروں سے بھی گہرا نکلا

تشنگی جم گئی پتّھر کی طرح ہونٹوں پر
ڈوب کر بھی ترے دریا سے میں پیاسا نکلا

جب کبھی تجھ کو پکارا مری تنہائی نے
بُو اُڑی پھول سے تصویر سے سایا نکلا

کوئی ملتا ہے تو اب اپنا پتہ پوچھتا ہوں
میں تری کھوج میں تجھ سے بھی پرے جا نکلا

مجھ سے چھپتا ہی رہا تو مجھے آنکھیں دے کر
میں ہی پردہ تھا اٹھا میں تو تماشا نکلا

توڑ کر دیکھ لیا آئنۂ دل تو نے
تیری صورت کے سوا اور بتا کیا نکلا

نظر آیا تھا سرِ بام مظفرؔ کوئی
پہنچا دیوار کے نزدیک تو سایا نکلا

○

پتھر بھی مجھے شرمندۂ گفتار نہ کر دے
اُونچا مری آواز کو دیوار نہ کر دے

مجبورِ سخن کرتا ہے کیوں مجھ کو زمانہ
لہجہ مرے جذبات کا اظہار نہ کر دے

زنجیر سمجھ کر مجھے توڑا تو ہے تُو نے
اب تجھ کو پریشاں مری جھنکار نہ کر دے

رہ جاؤں نہ میں اپنے ہی قدموں سے کچل کر
پامال مجھے خود مری رفتار نہ کر دے

میں خود کو مٹا کر ترا شہکار بنا ہوں
نیلام مجھے تو سرِ بازار نہ کر دے

چلتا ہوں تو پڑتے ہیں قدم میرے ہوا پر
ڈرتا ہوں ہوا چلنے سے انکار نہ کر دے

ہر سانس نئے زخم لگاتی ہے مظفرؔ
ٹکڑے مرے اک روز یہ تلوار نہ کر دے

○

روشنی کے روپ میں، خوشبو میں یا رنگوں میں آ
میں تجھے پہچان لوں گا کتنے ہی چہروں میں آ

بند آنکھوں میں بھی کیا ہوگی تری بے پردگی
چھین لے مجھ سے یہ نیندیں یا مرے خوابوں میں آ

ناچ اُٹھے رقاصۂ جاں دھڑکنوں کی تھاپ پر
ساز ہاتھوں میں اُٹھائے دل کے سناٹوں میں آ

تو جو شرماتا ہے میرے سامنے آتے ہُوئے
اوڑھ لے میرا تصوّر پھر مری باہوں میں آ

کر دیے ہیں زندگی نے مختلف حصّے مرے
مجھ سے ملنا ہے اگر، بٹ کر کئی سایوں میں آ

شہر میں بھی خاک اُڑاتی پھر رہی ہیں وحشتیں
چھوڑ ویرانے مظفرؔ اب گلی کوچوں میں آ

○

چلتی ہے اب تو سانس بھی اس احتیاط سے
جیسے گزر رہی ہو کسی پُل صراط سے

کرتا ہوں اب مری ہُوئی خوشبو پہ اکتفا
چُنتا ہوں پھُول مقبرۂ انبساط سے

مفہوم میرا نام ہے سمجھو مجھے ذرا
کج بحثیاں کرو نہ خطوط و نقاط سے

رائج ہیں میرے درد کے سکّے جہان میں
چمکا نہ زندگی مجھے آبِ نشاط سے

کس رُخ سے چل رہا ہے مظفؔر زمانہ چال
بازی کا کچھ پتہ نہیں چلتا بساط سے

○

دل ہو حساس تو جینے میں بہت گھاٹا ہے
میں نے خود اپنے ہی زخموں کا لہو چاٹا ہے

مجھ پہ احساں ہے، مری تیشہ بکف سانسوں کا
زندگی تجھ کو پہاڑوں کی طرح کاٹا ہے

ڈوب کر دیکھ سمندر ہوں میں آوازوں کا
طالبِ حسنِ سماعت مرا سنّاٹا ہے

میں چٹانوں کی طرح جن کی کمیں گاہ بنا
رفتہ رفتہ اُنھیں لہروں نے مجھے چاٹا ہے

مر چکا ہوں میں کئی بار جہاں کے ہاتھوں
اپنی لاشوں سے مظفرؔ یہ کنواں پاٹا ہے

○

مانا کہ مشتِ خاک سے بڑھ کر نہیں ہوں میں
لیکن ہوا کے رحم و کرم پر نہیں ہوں میں

انسان ہوں دھڑکتے ہوئے دل پہ ہاتھ رکھ
یوں ڈوب کر نہ دیکھ، سمندر نہیں ہوں میں

چہروں پہ مل رہا ہوں سیاہی نصیب کی
آئینہ ہاتھ میں ہے سکندر نہیں ہوں میں

اس قحطِ دوستی میں کوئی مجھ سے کیا ملے
خود اپنے آپ کو بھی میسّر نہیں ہوں میں

رکھتا ہو جو بدلتی ہوئی قدر پہ نظر
اُس ذہن کی رسائی سے باہر نہیں ہوں میں

غالبؔ تری زمین میں لکھی تو ہے غزل
تیرے قدِ سخن کے برابر نہیں ہوں میں

لفظوں نے پی لیا ہے مظفرؔ مرا لہو
شہ پارۂ سخن ہوں سخنور نہیں ہوں میں

حسن پہچانے گی میرا ، دیکھنے والی نظر
خوں تو ہے آنکھوں میں چہرے پر اگر غازہ نہیں

تم ہی اے خاموشیو پتھر اٹھا لو ہاتھ میں
کوئی نغمہ ، کوئی نالہ ، کوئی آوازہ نہیں

مانگتے ہیں کیوں مظفرؔ لوگ بارش کی دعا
تشنگیِ روح کا جسموں کو اندازہ نہیں

○

آئینہ دیکھ دیکھ کے خود پر فدا نہ ہو
تجھ سے حسیں کوئی ترے اندر چھپا نہ ہو

صورت اُبھر ہی آئے گی لوحِ خیال پہ
تیری صدا ہی آئے اگر سامنا نہ ہو

اس شہرتِ عظیم سے گمنام ہی بھلے
سب جانتے ہوں اور کوئی آشنا نہ ہو

اپنے پتے پہ ڈھونڈھنے نکلا تو ہوں تجھے
تو بھی کوئی فریب نہ ہو واہمہ نہ ہو

طرزِ خرام ایسی کوئی سیکھ لے صبا
شاخوں سے پھول پھول سے خوشبو جدا نہ ہو

ذرّوں سے آ رہی ہے برہنہ بدن کی بُو
اُڑتا ہُوا غبار، کسی کی قبا نہ ہو

روتا پھرے گا مرگِ صدا پر گلی گلی
پتّھر دلوں کے شہر میں نغمہ سرا نہ ہو

نکلا تو ہُوں پہن کے میں شعلوں کا پیرہن
ڈرتا ہوں، راستے میں مظفرؔ، ہوا نہ ہو

○

درد تو پیاس بجھانے کو اگر دے گا مجھے
بجھ گئی پیاس تو کس آگ میں جھونکے گا مجھے

چاٹ اتنی نہ لگا تو بھی مجھے تنہائی کی
ورنہ موجودگی میں بھی مری ڈھونڈھے گا مجھے

میں ہر اک دل کی سلگتی ہوئی چنگاری ہوں
راکھ اپنی ہی کریدے گا جو چھیڑے گا مجھے

کتنے پہلو تری آنکھوں سے رہیں گے اوجھل
تو بھی جب تک مری آنکھوں سے نہ دیکھے گا مجھے

وقت اتنی بھی نہ کیا قدر کرے گا میری
ایک لمحے کی بھی جاگیر نہ سمجھے گا مجھے

کاٹ دینا یہ زباں سچ تو مجھے کہنے دو
چُپ رہا تو مرا احساس بھی کوسے گا مجھے

میں تو نکلا تھا مظفرؔ اُسے اپنانے کو
کیا خبر تھی یہ جہاں مجھ سے ہی چھینے گا مجھے

○

کونسی دہلیز پہ خم اپنی پیشانی کرے
آدمی کتنے خداؤں کی ثنا خوانی کرے

جینے والے پر لگاتی ہے یہ شرطیں زندگی
دل جلائے، سانس گن کر لے، لہو پانی کرے

چھین کر تو نے قبا ڈھانپا ہے زخموں سے بدن
کون سے دل سے تری تعریف عریانی کرے

کیا ڈبو سکتی ہے اُن کو مصلحت ملّاح کی
جن کی ٹوٹی کشتیوں سے پیار طغیانی کرے

آدمی سے آدمی اتنا تو رکھے واسطہ
اجنبی ہو، بات لیکن جانی پہچانی کرے

دے کے لالچ رونقوں کا، لے چلی بازار میں
دیکھیے اب کیا تماشا گھر کی ویرانی کرے

سوچ کی ذلّت سہوں یا تابعِ دنیا رہوں
ذہن منصوبے بنائے دِقت من مانی کرے

کیا رکھے اُس کے قد و قامت سے دلچسپی کوئی
جو مظفؔر اپنے سائے کی نگہبانی کرے

○

میں بھی بِک جاؤں، اگر رسم یہ ڈالی جائے
سر تو نیلام ہو پگڑی نہ اُچھالی جائے

ہاتھ میں کچھ نہ سہی تیشۂ آواز تو ہے
جُوئے الفاظ چٹانوں سے نکالی جائے

کاٹ دے پاؤں، اگر بھیک نہیں دے سکتا
تیری دہلیز سے آگے نہ سوالی جائے

میری نس نس میں جو خوں ہے ترے دامن پہ بھی
ہاتھ اُٹھا ہے تو اب وار نہ خالی جائے

رتجگوں کا مرے کچھ بھی تجھے احساس نہیں
تیری آنکھوں سے اگر نیند اُڑا لی جائے

ہونٹ سی کر مرے، فرمان کیا ہے جاری
اس سخنور کی کوئی بات نہ ٹالی جائے

"حبسِ بے جا" نظر آتی ہے مظفر دنیا
دشت سے راہ، بگولوں سے قبا لی جائے

○

یہ کون مجھ میں اپنی زباں کھولتا رہا
پتھر بھی آئینے کی طرح بولتا رہا

یوں اُس میں جذب ہوگئیں میری حرارتیں
اُس پھول پر کرن کی طرح ڈولتا رہا

کیا اُس سے بحث کرتی مری کم سخن نظر
ہر زاویے سے اُس کا بدن بولتا رہا

بھیجا جکڑ کے یوں مجھے سانسوں کی ڈور میں
جب تک میں جی سکا یہ گرہ کھولتا رہا

بے اختیار یاں مرے ماتھے پہ تھیں رقم
میں ٹھوکروں میں ارض و سما رولتا رہا

ہلکی ہوا کے ساتھ چلیں خوشبوئیں مری
تیز آندھیوں میں پرچمِ جاں کھولتا رہا

تھیں اُس کی قربتیں بھی مظفرؔ بنا ڈی
ٹوٹی ترازوؤں میں مجھے تولتا رہا

○

خواب کیسا دلِ بیتاب دکھائے ہم کو
جس کی تعبیر بھی اک خواب دکھائے ہم کو

توڑ کر اپنی حدیں ہم جو نکلنا چاہیں
زندگی پنجرۂ اعصاب دکھائے ہم کو

بسترِ جاں پہ سکوں سے نہیں سوتے ہم بھی
کروٹیں لے کے نہ گرداب دکھائے ہم کو

اُس کے سینے سے کوئی ایک کرن تو لے دے
اپنے ہاتھوں پہ جو مہتاب دکھائے ہم کو

کچھ ہماری بھی نظر اُس کا تقدّس توڑے
وہ بھی کچھ شوخیٔ آداب دکھائے ہم کو

چند بوندوں کی مظفؔر ہیں یہ آنکھیں پیاسی
اور گھٹا منظرِ سیلاب دکھائے ہم کو

○

کب نشاں میرا کسی کو شبِ ہستی میں ملا
میں تو جگنو کی طرح اپنی ہی مُٹھی میں ملا

بھاگ نکلا تھا جو طوفاں سے چھڑا کر دامن
سرِ ساحل وہی ڈوبا ہُوا کشتی میں ملا

آنکھ روشن ہو تو دنیا کے اندھیرے کیا ہیں
رشتہ مہتاب کو راتوں کی سیاہی میں ملا

میں جلاتا رہا تیرے لیے لمحوں کے چراغ
تُو گزرتا ہُوا صدیوں کی سواری میں ملا

تو نے منگتوں کو اُچٹتی ہُوئی نظریں بھی نہ دیں
ہاتھ پھیلایا نہ جس نے اُسے جھولی میں ملا

میں اک آنسو ہی سہی، ہوں بہت انمول مگر
یوں نہ پلکوں سے گرا کر مجھے مٹی میں ملا

محفلوں میں کیا لوگوں نے مظفرؔ کو تلاش
وہ بھٹکتا ہُوا افکار کی وادی میں ملا

○

سخنوری ہمیں کب تجربے سے آئی ہے
زباں میں چاشنی دل ٹوٹنے سے آئی ہے

جدھر سے میرا بدن دھوپ چاٹ کر گزرا
ہوائے سرد اُسی راستے سے آئی ہے

تڑپتا میں ہوں پسینہ ہے اُس کے ماتھے پر
شکستِ دل کی صدا آئینے سے آئی ہے

کھُلا ثبوت ہے یہ دشمنوں کے شبخوں کا
کہ دھول ٹھہرے ہُوئے قافلے سے آئی ہے

سفر میں ساتھ مرا اور کوئی کیا دیتا
ہَوا بھی میری طرف سامنے سے آئی ہے

سحر نے مجھ کو مظفرؔ نہیں کیا صیقل
مری نظر میں چمک رتجگے سے آئی ہے

○

قہقہے مجھ سے نہ اتنے کبھی مستی میں لگے
جتنے پیوند مرے جامۂ ہستی میں لگے

پھونک دوں گھر کہ تماشا تو میسّر آئے
کوئی میلہ نہ سہی آگ ہی بستی میں لگے

حادثوں نے مجھے لوٹا ہے خزانے کی طرح
زخم بھی کتنے سنہرے تہی دستی میں لگے

خود مرے ہاتھ نے مارا مجھے پہلا پتّھر
یوں تو چہرے بہت اصنام پرستی میں لگے

رفعتِ خاک پہ رکھتا ہوں مظفّؔر جو قدم
آسماں بھی مجھے گرتا ہُوا پستی میں لگے

○

کوئی مستقبل اور کوئی ماضی لے کر آیا
اپنے اپنے مطلب کی محرومی لے کر آیا

آیا تو ہے اب کے بھی پھولوں کا موسم لیکن
کچّے رنگ اور خوشبوئیں مصنوعی لے کر آیا

برسائے مجھ پر بھی دنیا بینائی کے پتّھر
آنکھوں کے میلے میں چہرہ میں بھی لے کر آیا

دامن دامن پہنچائے ہیں میں نے اپنے آنسو
لیکن مجھ تک کوئی نہ اُن کے معنی لے کر آیا

جس کو شاخوں پر ٹھہرایا اُس نے ہی جڑ کاٹی
جس کے اندر ڈوبے، سازش گہری لے کر آیا

بوسیدہ ذہنوں پہ گزرا ہوں میں بارِ مظفؔر
جب میں لہجہ اپنا سوچیں اپنی لے کر آیا

○

تیری جھلک نگاہ کے ہر زاویے میں ہے
دیکھوں تو اپنی شکل مرے آئینے میں ہے

لٹکی ہوئی ہے روح کی سولی پہ زندگی
سانسوں کا سلسلہ ہے کہ رسّی گلے میں ہے

ڈالوں کہاں پڑاؤ کہ رستے بھی ہیں رواں
منزل بھی کیا ملے کہ وہ خود قافلے میں ہے

میری صدا کے پھول چڑھاتے ہیں مجھ پہ لوگ
زندہ ہوں میں مگر مرا فن مقبرے میں ہے

کانٹوں کی پیاس نے مجھے کھینچا برہنہ پا
جیسے بھری سبیل ہر اک آبلے میں ہے

سانسوں کی اوٹ لے کے چلا ہوں چراغِ دل
سینے میں جو نہیں وہ گھٹن راستے میں ہے

میں تجھ کو چاہتا رہوں حاصل نہ کر سکوں
لذّت وہ قرب میں کہاں جو فاصلے میں ہے

پایا صلہ یہ، تجھ کو مظفؔر نے ڈھونڈھ کر
شامل اب اُس کا نام بھی تیرے پتے میں ہے

○

معاف تجھ کو میں دنیا اگر نہیں کرتا
تو اپنے آپ سے بھی درگزر نہیں کرتا

مسافتوں کی نظر میں کہیں نہ گر جاؤں
ہواؤں کو بھی شریکِ سفر نہیں کرتا

ہو اپنے سینۂ روشن پہ اعتماد جسے
وہ انتظارِ طلوعِ سحر نہیں کرتا

نکاتِ حسن پہ کرتا ہوں غور اچھی طرح
میں رائیگاں یونہی نقدِ نظر نہیں کرتا

وہ اقتدار کا حق مانگتا ہے صدیوں سے
جو ایک لمحے کے سینے میں گھر نہیں کرتا

کبھی جو دیکھا ہو تو خواہشوں کو پہچانوں
جدھر یہ دل کھینچے، آنکھیں ادھر نہیں کرتا

میں آپ اپنے ارادے بلند رکھتا ہوں
بھروسہ قامتِ محبوب پر نہیں کرتا

ابھی شعورِ مظفرؔ کرے گا جذب تجھے
یہ زہر وہ ہے جو فوراً اثر نہیں کرتا

○

سفر بھی دور کا ہے راہ آشنا بھی نہیں
چلا اُدھر ہوں کہ جس سمت کی ہوا بھی نہیں
گزر رہا ہوں قدم رکھ کے اپنی آنکھوں پہ
گئے دنوں کی طرف مڑ کے دیکھتا بھی نہیں
مرا وجود مری زندگی کی حد نہ سہی
کبھی جو طے ہی نہ ہو میں وہ فاصلہ بھی نہیں
فضا میں پھیل چلی میری بات کی خوشبو
ابھی تو میں نے ہواؤں سے کچھ کہا بھی نہیں
ہے زندگی تری محفل میں کس قدر ارزاں
روا ہے قتل بھی دستورِ خوں بہا بھی نہیں
سمجھ رہا ہوں مظفرؔ اُسے شریکِ سفر
جو میرے ساتھ قدم دو قدم چلا بھی نہیں

○

ہر آدمی ہے اپنے ہی اندر چھپا ہُوا
جانے کس آستیں میں ہے خنجر چھپا ہُوا

باہر ہیں کیا بلند فصیلیں کھڑی کروں
میرا غنیم تو ہے مرے گھر چھپا ہُوا

تاریکیوں کے خوف سے آنکھیں نہ بند کر
شاید چمک اُٹھے کوئی منظر چھپا ہُوا

کیا کیا عقیدتوں کے سجے ہیں مجسمے،
صحنِ حرم میں ہے کوئی آذر چھپا ہُوا

جھونکے نچوڑنے ہیں تو ساحل کی فکر کر
ہے ان ہواؤں میں بھی سمندر چھپا ہُوا

سبزے کی سمت جائیے تلوار سونت کر
پیڑوں کی اوٹ میں نہ ہو لشکر چھپا ہُوا

قولِ وفا تو کر ہی لیا مجھ سے آپ نے
اب جیب سے نکالیے پتھر چھپا ہُوا

اب تو میں اپنے سائے سے بھی بدگمان ہوں
وہ سامنے ہے اور ہے سراسر چھپا ہُوا

گھبرا گھُٹی فضا سے مظفرؔ نہ اس قدر
ہو گا اِسی سُرنگ میں اک در چھپا ہُوا

○

مجھ سے پہلے یہاں بھٹکے ہیں مسافر کتنے
نقشِ پا، میرے تعاقب میں ہیں آخر کتنے

رونقِ شہر ہے سوئی ہُوئی دو قبروں میں
ہو گئے دفن ان آنکھوں میں مناظر کتنے

عالمِ کرب ہے آباد ہمارے اندر
پُرسکوں ہم نظر آتے ہیں بظاہر کتنے

غنچۂ ذہن چٹکتا ہے نہ لَو دیتا ہے خوں
لفظ ہیں کتنے شفق رنگ ہیں جابر کتنے

کانپتے ہونٹ، بجھا چہرہ، سلگتی آنکھیں
ایک تصویر مری اور مصوّر کتنے

میرے بدلے ہُوئے معیار پہ حیرت کیسی ؟
روپ تو نے بھی تو بدلے مری خاطر کتنے

تیری آہٹ سے خیالوں کا تسلسل ٹوٹا
اُڑ گئے ایک ہی آواز سے طائر کتنے

جن کی تخلیق مظفرؔ ہے دلوں پر کندہ
آج کے دور میں اس ڈھب کے ہیں شاعر کتنے

○

خود مری آنکھوں سے اوجھل میری ہستی ہو گئی
آئینہ تو صاف ہے تصویر دھندلی ہو گئی

سانس لیتا ہوں تو چبھتی ہیں بدن میں ہڈّیاں
روح بھی شاید مری اب مجھ سے باغی ہو گئی

فاش کر دیں میں نے خود اندر کی بے ترتیبیاں
زندگی آرائشوں میں اور ننگی ہو گئی

پیار کرتی ہیں مرے رشتوں سے کیا کیا بندشیں
توڑ دی زنجیر تو دیوار اونچی ہو گئی

میری جانب آئے پس منظر سے پتھر بے شمار
رنگِ دنیا دیکھ کر بینائی زخمی ہو گئی

پڑ گیا پردہ سماعت پر مری آواز کا
ایک آہٹ کتنے ہنگاموں پہ حاوی ہو گئی

کر گیا ہے مبتلائے کرب اور اک سانحہ
اور کچھ دن زندہ رہنے کی تلافی ہو گئی

خواہشوں کی آگ بھی بھڑکاٹے گی اب کیا مجھے
راکھ بھی میری مظفرؔ اب تو ٹھنڈی ہو گئی

○

ہے سنگِ خامشی پہ فضا سر دھرے ہُوئے
آباد گھر بھی گھر نہ ہُوئے مقبرے ہُوئے

ہر شخص ہے حنوط شدہ لاش کی طرح
آنکھوں میں تیرتے ہیں مناظر مرے ہُوئے

پھیلی ہے یوں تو شہر میں ہر سمت روشنی
پھرتے ہیں لوگ سائے سے اپنے ڈرے ہُوئے

تلوار کیا کسی پہ اُٹھائے گا وہ جری
ہیں جس کے دونوں ہاتھ دعا سے بھرے ہُوئے

اس دورِ خود فریب سے ہوں خوب آشنا
مجھ سے مرے خلاف یہاں مشورے ہُوئے

جی بھر کے خاک بھی نہ مظفرؔ اُڑا سکا
ٹپکا لہو جو زخم سے، جنگل ہرے ہُوئے

○

آگ سے سیراب دشتِ زندگانی ہو گیا
شعلۂ دل آنکھ میں آیا تو پانی ہو گیا

تیری آنکھیں آئنہ ہاتھوں میں لے کر آ گئیں
روبرو ہو کر تجھے میں اپنا ثانی ہو گیا

جب بھڑک اُٹھا تھا تیرے قرب سے میرا بدن
نام اُن حساس لمحوں کا جوانی ہو گیا

کر دیا تھا میں نے جو آوارہ پتّوں پر رقم
راز وہ رُسوا ہواؤں کی زبانی ہو گیا

ایک اَنمٹ روشنی تھا عرش کی محراب پر
آدمی کے روپ میں آ کر میں فانی ہو گیا

جن کے سینوں میں دھڑکتا تھا مظفرؔ میرا دل
آج میں اُن کے لیے بھولی کہانی ہو گیا

○

کھنچ آئے دل کا زخم بھی یوں کھینچ تیر کو
پتھّر پہ ہاتھ رکھ کے اُٹھالے لکیر کو
زنجیر تیری یاد ہے زنداں ترا خیال
کیسے رہا کرے گا اب اپنے اسیر کو
دنیا تجھے بھی رَس کے پیالے پلائے گی
دے زہر اپنے ہاتھ سے پہلے ضمیر کو
وعدہ معاوضے کا نہ کرتا خدا اگر
خیرات بھی سخی سے نہ ملتی فقیر کو
یوں ہر غمِ جہاں کو لگاتا رہا گلے
بہلائے جس طرح کوئی طفلِ شریر کو
تنہائیوں میں کی ہے مظفرؔ نے یوں بسر
گزرا ہو جیسے چیر کے جسمِ غفیر کو!

○

بہت دریدہ دہن ہوں جواب کیا لے گا
جو خود غلط ہے وہ مجھ سے حساب کیا لے گا

اب آدمی کو ضرورت نہیں تغیّر کی
بدل کے رنگِ جہاں انقلاب کیا لے گا

بڑھے گی حد سے تو پی جاؤں گا میں پیاس اپنی
مجھے فریب میں رکھ کر سراب کیا لے گا

اک اور نام تراشے گا سنگِ ہستی پہ
اُڑا کے خاک مری، اضطراب کیا لے گا

نگارشوں میں خط و خال کا سا حسن کہاں
جو صورتوں کا ہو قاری، کتاب کیا لے گا

مجھے عزیز ہے جو دُکھ ملے ترے ہاتھوں
خراب کر کے مجھے، تو ثواب کیا لے گا

دیارِ خشک سے گزرے تو کچھ دعائیں ملیں
سمندروں پہ برس کر سحاب کیا لے گا

ہر ایک دل میں جگہ پائی ہے مظفرؔ نے
امیرِ شہر سے، تمغے، خطاب، کیا لے گا

○

شب کا سکوت، دشت کی تنہائی دے گیا
کیا کیا وہ یادگارِ شناسائی دے گیا

آنکھوں کی طرح دل کے دریچے بھی کھل گئے
جھونکا ہوا کا زخم کو بینائی دے گیا

قاتل کی دوستی کا سزایافتہ ہوں میں
مانگا تھا درد، زہرِ مسیحائی دے گیا

جھک کر تری جبیں پہ حیا جس کو لے اُڑی
وہ رنگ اور بھی تجھے رعنائی دے گیا

میں نے قلم سمجھ کے اُٹھایا جو موج کو
طوفان میری سوچ کو گہرائی دے گیا

سنتا رہا ہوں اُس کی صدا اُس کے بعد بھی
وہ بام و در کو قوّتِ گویائی دے گیا

آنکھیں ملا کے مجھ سے مظفرؔ گیا کوئی
یا تحفۂ مرقعِ چغتائی دے گیا

○

زندگی کھنچ گئی مجھ سے ترے ابرو کی طرح
اپنے ہی خون کا پیاسا ہوں لبِ جُو کی طرح

شعلۂ سوزِ دروں سرد ہُوا جاتا ہے
کوئی سمجھائے صبا کو کہ چلے لُو کی طرح

وہ ستارا جو مرے نام سے منسوب ہُوا
دیدۂ شب میں ہے اک آخری آنسو کی طرح

کوئی دیوانہ اُٹھے خاک اُڑانے کے لیے
آج بھی دشت ہیں پھیلے ہُوئے بازو کی طرح

اس بھرے شہر میں کرتا ہوں ہوا سے باتیں
پاؤں پڑتے ہیں زمیں پر مرے آہو کی طرح

شبنمی ہاتھ بڑھاؤ کہ کھلے دروازہ
بن کھلے پھول کے زنداں میں ہوں خوشبو کی طرح

چاہتے ہیں جو مظفؔر غمِ ہستی سے فرار
بیٹھ جائیں وہ گڑھا کھود کے سادھو کی طرح

○

گم ہیں تمام وسعتیں میری اُڑان میں
میں آسکا نہ اپنے ہی وہم و گمان میں

تنہائیاں اُٹھا نہ سکیں روشنی کا بوجھ
سائے بھی دفن ہو گئے خالی مکان میں

صحرائے شب میں خیمۂ دل کیسے جل اُٹھا
پھینکی ہے آگ رکھ کے کسی نے کمان میں

لہروں کا اضطراب سفینہ ڈبو نہ دے
چلتی ہے منہ چھپا کے ہوا بادبان میں

پہنا رہا ہوں میں اُسے پیراہنِ خیال
الہام کی طرح کوئی اُترا ہے دھیان میں

کُھل جائے میرے سر پہ نہ گٹھڑی حیات کی
میں دب کے رہ نہ جاؤں خود اپنی اُٹھان میں

اِس شہرِ تشنگی کی وہ چھانی ہے میں نے خاک
کانٹے پڑے ہوئے ہیں مظفرؔ زبان میں

○

روشنی کی طرح تو ہر سمت ہے پھیلا ہُوا
اپنے سائے پر مجھے اکثر ترا دھوکا ہُوا

میرے دل کی آگ کا تجھ کو نہیں آتا یقیں
میں نے دیکھا ہے چٹانوں سے دھواں اُٹھتا ہُوا

بچ گئی مٹی میں رُلنے سے متاعِ آرزو
جم گیا پیروں پہ آنکھوں سے لہو ٹپکا ہُوا

شام کا چہرہ دھندلکوں میں دمکتا ہے ابھی
کیا کسی گوشے میں ہے سورج کا دم اٹکا ہُوا

رہروانِ دید رُک جاؤ کدھر سے جاؤ گے
پتلیوں کا قافلہ آنکھوں میں ہے ٹھہرا ہُوا

کون کہتا ہے مظفرؔ، آدمِ جنّت بدر
شیشۂ گیتی پہ اک پتھر ہوں میں پھینکا ہُوا

○

مانگے کی دلکشی سے نہ خود کو سنواریے
مٹی کی یہ قبا تو بدن سے اُتاریے

دست بجے نہ اپنے شوق کو جھوٹی تسلّیاں
خوں میں ڈبو کے تیر خلا میں نہ ماریے

آنکھیں بھی یوں اُٹھیں کہ طلب کی ہتک نہ ہو
وہ ہاتھ بھی بڑھے تو نہ دامن پساریے

پھوٹے گا نکہتوں کی طرح زخم سے لہو
اس پھول جیسے ہاتھ سے پتھّر نہ ماریے

پڑھتا ہوں روز چہرہ بھی اخبار کی طرح
غزلوں میں لکھ رہا ہوں مظفرؔ ادا ریے

○

آکر بھی دھیان میں نہ رہے اوجھل نظر سے ہم
گزرے مثالِ موج زمانے کے سر سے ہم
دستِ صبا نے چاک کیا اُس کا پیرہن
جس گل کو چھُو سکے نہ لطافت کے ڈر سے ہم
مشعل بنے ہر ایک مسافر کے ہاتھ کی
لپٹے نہ نقشِ پا کی طرح رہ گزر سے ہم
پڑتا ہے روز اک نئے سورج سے واسطہ
بیزار ہو گئے ہیں طلوعِ سحر سے ہم
کب سے خود آگہی کے چوراہے پہ ہیں کھڑے
ملتے ہیں اپنے آپ کو دیکھیں کدھر سے ہم
دنیا سے ہو رہی ہے مظفر روانگی
سچ تو یہ ہے کہ لوٹ رہے ہیں سفر سے ہم

○

زخمِ دل اور ہرا خونِ تمنا سے ہُوا
تشنگی کا مری آغاز ہی دریا سے ہُوا

چُبھ گئی حلق میں کانٹوں کی طرح پیاس مری
دشت، سیراب مرے آبلۂ پا سے ہُوا

دلِ زندہ کو چُنا درد کی دیواروں میں
روک لیتی مجھے، اتنا بھی نہ دنیا سے ہُوا

سر میں سودا تھا مگر پاؤں میں زنجیر نہ تھی
خاک اُڑاتا رہا، منسوب نہ صحرا سے ہُوا

پھیر دیں کس نے سلاخیں سی مری آنکھوں میں
کون انگشت نما طاقِ تماشا سے ہُوا

دُور جا کر مری آواز سُنی دنیا نے
فن اُجاگر مرا آئینۂ فردا سے ہُوا

بُو مزاجوں سے گئی رنگ اُڑے چہروں کے
خوش یہاں کون مِرے دیدۂ بینا سے ہُوا

اجنبی سا نظر آیا ہوں مظفرؔ خود کو
بے تکلّف جو میں اس عہدِ شناسا سے ہُوا

○

چہرہ کسی کا صاف گریبان میں نہیں
جو بات آئینے میں ہے انسان میں نہیں

کیوں کوئی مجھ سے میرے دکھوں کا حساب لے
دنیا میں ہوں میں حشر کے میدان میں نہیں

طرزِ ادائیگی کہیں معنی بدل نہ دے
آنکھیں ملا کے بات کرو کان میں نہیں

وہ دل کے ساتھ لے گیا میرے حواس بھی
ہیں پھر بھی فائدے میں ہوں نقصان میں نہیں

دونوں طرف سجائے گئے پھول ایک سے
بالوں میں جو کشش ہے وہ گلدان میں نہیں

○

دیکھا اِدھر اُدھر بھی تو ٹھوکر لگی مجھے
اپنی ہی چاپ راہ کا پتھّر لگی مجھے

بھڑکا ہُوا تھا شعلۂ احساس اس قدر
صحرا کی دھوپ سائے سے بہتر لگی مجھے

تقسیم ہو گیا ہوں میں خیرات کی طرح
دنیا کسی فقیر کی چادر لگی مجھے

بادل بھی گھر کے آئے تو برسی ہے مجھ پہ آگ
برسات، دوزخی کا مقدّر لگی مجھے

یوں دل بجھا کہ خون سے اُٹھنے لگا دھواں
اُٹھتے دُھوئیں کی لو ترا پیکر لگی مجھے

دیکھا تجھے جو سادگیوں کے لباس میں
تجھ پر حیا بھی قیمتی زیور لگی مجھے

پتھرا چلا ہے جسم بھی آنکھوں کے ساتھ ساتھ
وہ ضربِ انتظار مظفرؔ لگی مجھے

○

جم کر رگوں میں خوں صفتِ سنگ رہ گیا
جینے کا اب تو ایک یہی ڈھنگ رہ گیا

حیرت سے تک رہا تھا زمانے کی سمت میں
اپنی طرف نگاہ جو کی دنگ رہ گیا

آتی ہے اب بھی بوئے وفا زخم زخم سے
سب رنگ اُڑ گئے یہی اک رنگ رہ گیا

دامانِ اختیار میں ہر چیز تھی مگر
شیشہ رہا نہ پھول رہا سنگ رہ گیا

ٹوٹا جو دل نہ آئی صدائے شکست بھی
یہ ساز یوں بھی تشنۂ آہنگ رہ گیا

پھیلیں نہ کیوں جہاں میں مظفرؔ ہلاکتیں
موضوعِ کائنات فقط جنگ رہ گیا

○

زندگی طنز نہ کر تو مری ویرانی پر
ہیں مرے خون کے چھینٹے تری پیشانی پر

میرے زخموں کا تماشا نہ بنالے دنیا
ڈال دو آنکھ کا پردہ مری عریانی پر

شعلہ و موج کے سنگم پہ کھڑا ہوں تنہا
دشت بھی جلتے ہیں دریا بھی ہیں طغیانی پر

نقدِ جاں لے کے میں نکلا تو وہ حیران ہوئے
ہنس رہے تھے جو مری بے سروسامانی پر

لے گئیں دور کنارے سے مظفرؔ موجیں
جب گرا عکس مرا بہتے ہوئے پانی پر

○

خاکِ قدم بنے ہیں کئی بار راستے
پھر بھی نہ پا سکے مری رفتار راستے

لے کر چلی تھی مجھ کو دبے پاؤں زندگی
آہٹ سے پھر بھی ہو گئے بیدار راستے

مانندِ سنگِ میل میں حیران رہ گیا
کترا کے جب گئے ہیں ملنسار راستے

طے ہو چکا ہے کتنا سفر کچھ خبر نہیں
میں اجنبی ہوں اور پُر اسرار راستے

اک پردۂ نظر ہیں بظاہر بہ پیچ و خم
لے کر چلے ہیں دھیان کے اُس پار راستے

تلووں کی میرے چاٹ پڑی ہے زمین کو
کرتے ہیں ہمتوں سے مری پیار راستے

کیسی یہ سامنے کی مظفرؔ چلی ہوا
چلنا بھی ہو گئے مجھے دشوار راستے

○

مرا تو حزبِ مخالف بھی میری ذات میں ہے
میں آئنہ بھی ہوں پتھر بھی میرے ہات میں ہے

کھُلی فضاؤں کی چادر نہ سر پہ اوڑھ کے چل
ہوائے شہر تری خوشبوؤں کی گھات میں ہے

جو ڈھونڈھنا ہے تو مہتاب سی نظر لاؤ
چھپا ہُوا کوئی چہرہ سیاہ رات میں ہے

مرا شعورِ تجسّس بھی اُس سے ہار گیا
میں شاخ شاخ پکاروں وہ پات پات میں ہے

صدائے دل کی مظفرؔ بناؤ تصویریں
سُنے گا کون، بہت شور کائنات میں ہے

○

جب کبھی تنقید کی ہے موجۂ گرداب پر
سینکڑوں شکنیں اُبھر آئیں جبینِ آب پر

کانپتے ہیں رات کے پردے میں کیوں کرنوں کے ہاتھ
داغ یہ کس نے لگایا چادرِ مہتاب پر

آئی ہے جنگل کے پھولوں سے مجھے بُوئے وفا
مر مٹا ہوں میں تو اس ویرانیِ شاداب پر

راکھ کا اک ڈھیر بن کر رہ گیا سینے میں دل
آگ برساتی رہی دنیا مرے اعصاب پر

ہے مرے قدموں کے نیچے سے زمیں نکلی ہوئی
چل رہا ہوں وقت کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر

یوں مظفرؔ آج اُن پلکوں پہ آنسو آ گئے
جس طرح جلتے دیے پیشانیِ محراب پر

○

رنگ اُڑے تصویر او جھل ہو گئی
وقت یوں سمٹا، صدی پل ہو گئی

لے لیا اپنی پناہوں میں مجھے
بھیگتی شب تیرا آنچل ہو گئی

پتھروں سے ہے سماعت کی اُمید
کیا مری آواز پاگل ہو گئی

خوں چراغوں میں جلایا رات بھر
آرزو کی سیج مقتل ہو گئی

خواہشوں کا میں کہاں تک ساتھ دوں
تھک گئے بازو، نظر شل ہو گئی

سانس لفظوں کی طرح مٹنے لگے
کیا کتابِ جاں مکمّل ہو گئی

○

دیکھ یوں میری طرف جیسے شناسائی نہ ہو
تیری آنکھوں پر تو عائد جرمِ دانائی نہ ہو

غم نہیں تو عکس بن کر تجھ سے وابستہ رہوں
دل ترا پتھر سہی لیکن نظر آئینہ ہو

گونج اٹھتی ہیں فضائیں کیوں مری آواز پر
کوئی ہنگامہ پسِ دیوارِ تنہائی نہ ہو

فطرتِ آزاد کے پیروں میں زنجیریں نہ ڈال
پیار کر خوشبو سے پھولوں کا تمنائی نہ ہو

ڈوب کر میں آپ ہی رہ جاؤں اپنی ذات میں
اس قدر بھی اے مظفرؔ مجھ میں گہرائی نہ ہو

○

سادہ لوحی سے میری دنیا نے کیا برتاؤ کیا
خود شیشہ پہنایا مجھ کو اور خود ہی پتھراؤ کیا

جسموں کا بے ڈھنگا پن ڈھانپا خوشبو کی شالوں سے
چہروں کی بے ترتیبی پر رنگوں کا چھڑکاؤ کیا

کیا اپنے کیا بیگانے، ذہنیت سب کی تاجر تھی
دوستیوں کی بولی دی رشتوں ناطوں کا بھاؤ کیا

دنیا کو خاموش کیا گھر کی دیواریں بول اُٹھیں
ہنگاموں سے بچ نکلے تنہائی نے گھیراؤ کیا

سُن کر میرے خواب مظفرؔ لے گئی دنیا آنکھیں بھی
مرہم تو کیا رکھتا کوئی گہرا اور بھی گھاؤ کیا

○

زندگی کھلتے ہُوئے در کی صدا لگتی ہے
سانس لیتا ہوں تو زخموں کو ہوا لگتی ہے

دُکھ گوارا ہیں جو پیش آئیں خوش اخلاقی سے
تیرگی جُھوم کے آئے تو گھٹا لگتی ہے

ایک پل دُور نظر سے نہیں ہونے دیتی
شبِ تنہائی بتا تُو مری کیا لگتی ہے

بے دھڑک آپ مری بات پہ ہنس دیتے ہیں
بن کے پتّھر یہ ہنسی، سینے پہ آ لگتی ہے

ہم بھی ہیں اپنے زمانے کے مظفؔر سقراط
تلخیٔ زیست ہمیں آبِ بقا لگتی ہے

○

اسیر میں کسی موسم کے بانکپن میں نہیں
لہو کے پھول مرے پاس ہیں چمن میں نہیں
رچا سکوں جسے انسانیت کے ہاتھوں پہ
ابھی وہ رنگ زمانے ترے چلن میں نہیں
بدن سے جلتے ہوئے ماس کی سی بُو آئے
یہ اور بات کہ سلوٹ بھی پیرہن میں نہیں
بنائی جاتی ہیں قبریں زمیں کے اُوپر بھی
یہاں کچھ ایسی بھی لاشیں ہیں جو کفن میں نہیں
کہاں سے لاؤں میں شادابیاں اِن آنکھوں میں
ہری بھری تو رگیں بھی مرے بدن میں نہیں
کوئی کمال ہو سرزد نہ کوئی بات بنے
حواس گم ہیں مظفرؔ زباں دہن میں نہیں

○

ساتھ ہرچند ہمسفر رکھنا
سامنے اپنی رہ گزر رکھنا

زندگی خواب بن کے رہ جائے
زانوئے شب پہ یوں نہ سر رکھنا

برف کی ناؤ میں تو بیٹھے ہو
آگ سی ذہن میں مگر رکھنا

خاک پر بھی اگر بناؤ محل
سنگِ بنیاد عرش پر رکھنا

بن گئے خول اب تو چہرے بھی
احتیاطِ دل و نظر رکھنا

لذتیں لے چلیں تمھارے حضور
تلخیاں گفتگو میں بھر رکھنا

لو مظفرؔ متاعِ شعر و سخن
اب نہ تم آرزوئے زر رکھنا

○

نشۂ جاں بھی اگر ساقیِ من ٹوٹے گا

بن کے انگڑائی تری، میرا بدن ٹوٹے گا

ہوئی ساکت جو زباں بول اٹھیں گی آنکھیں

کسی صورت بھی نہ یہ ربطِ سخن ٹوٹے گا

زندگی پائے گی کب طوق و سلاسل سے نجات

جانے کب سلسلۂ دار و رسن ٹوٹے گا

نئی قدریں ہیں تو اسلوب پرانے کیوں ہوں

نئے انساں ہیں تو یہ نظمِ کہن ٹوٹے گا

سیکھ لو چال بگولوں کی، صبا کے جھونکو

اس نزاکت سے کہیں سحرِ چمن ٹوٹے گا

کوچ کر جاؤں گا دنیا سے مظفّر لیکن

نام سے تو نہ مرے رشتۂ فن ٹوٹے گا

○

بارہا موت جیتے جی آئی
میرے کس کام زندگی آئی

جانے کتنے دکھوں کا خون ہُوا
کس قدر کرب سے ہنسی آئی

بھر لیا زہر اپنی آنکھوں میں
ہم کو دنیا نہ دیکھنی آئی

ایک تصویر سے مخاطب تھا
ایک آواز ڈھونڈھتی آئی

کس کو درکار ہے مرا سایہ
کس طرف سے یہ روشنی آئی

رنگ برتے بہت مظفؔر نے
راس تہذیبِ سادگی آئی

○

دل ہے روشن مرا، بجھتی ہوئی آنکھوں پہ نہ جا

گھر یہ آباد ہے ویران دریچوں پہ نہ جا

پیٹ خالی ہے تو اُگلے ہوئے لقموں سے نہ بھر

چل چکا جن پہ زمانہ انھیں رستوں پہ نہ جا

کھول کر آنکھ جھلستی ہوئی تعبیر بھی دیکھ

ساحلِ خواب سے اُٹھتی ہوئی لہروں پہ نہ جا

سر پہ یوں بوجھ اُٹھا پاؤں نہ بگڑے مٹّی

اپنا رُخ دیکھ کے چل تیز ہواؤں پہ نہ جا

شق ہوئے دل تو ہنسی چھوٹ گئی پھولوں کی

بات کی تہ میں اُتر ظاہری لہجوں پہ نہ جا

اپنے جذبے ہی مظفرؔ ترے کام آئیں گے

لوٹ لیں گے تجھے دنیا کے ارادوں پہ نہ جا

○

اپنی کشتی کی نہ جب ہم سے حفاظت کی گئی
روک لے لہریں ، سمندر کو نصیحت کی گئی

چور دروازوں سے بھی آتی نہ دیکھیں ظلمتیں
اس قدر روشن ضمیری پر قناعت کی گئی

دل کے تہ خانوں میں بازارِ ہوس کھولا گیا
ظرف کے سودے ہوئے نیلام غیرت کی گئی

دوستی کے ہاتھ نے توڑیں دلوں کی سرحدیں
پرچمِ تنظیم لہرا کر بغاوت کی گئی

دل میں تعبیریں تھیں اپنی آنکھ میں مانگے کے خواب
خود کو ہی دھوکا دیا خود سے شرارت کی گئی

قافلے شعلوں کے لے کر چل پڑی اندھی ہوا
کتنی بیدردی سے توہینِ قیادت کی گئی

پیار لہجوں سے ٹپکنا، آستینوں سے لہو
خواہشوں کی کس قدر روشن وضاحت کی گئی

دینے والے ہاتھ ہی کو جو قلم کرنے لگا
کیوں مظفرؔ ایسے منگتے پر سخاوت کی گئی

○

دست و پا رکھتے ہوئے بے دست و پا کیسے ہُوا
مجھ کو ہمّت ہارنے کا حوصلہ کیسے ہُوا

خوں رگوں میں تھا تو کانٹے حلق میں کیونکر پڑے
تشنگی کا طوق گردن کو عطا کیسے ہُوا

کس طرح غیرت کے سورج کی کرن خم کھا گئی
تیر سا انسان گھٹنوں پر کھڑا کیسے ہُوا

جھانک لیں اپنے گریباں میں تو مل جائے جواب
دوسروں سے پوچھتے ہیں کیوں ہُوا کیسے ہُوا

بے وفائی اُس نے کی یہ جُرم اُس کا بھی سہی
میں نے کب چاہا اُسے میں بے خطا کیسے ہُوا

آ گئی غالب شہادت پر اسیری کس طرح
زندۂ جاوید مُردوں کی غذا کیسے ہُوا

پھر گیا دریا کا رُخ پانی میں دَرزیں پڑ گئیں
منحرف تاریخ سے جغرافیہ کیسے ہُوا

تیرگی میں ساتھ کب چھوڑا مظفرؔ سائے نے
جب وہ میرا جسم تھا مجھ سے جُدا کیسے ہُوا

○

اب حشر زمینوں پہ بپا دیکھ رہا ہوں
ہر خاک کے پُتلے میں خدا دیکھ رہا ہوں

انسان کے ہاتھوں ہی اب انساں کی تباہی
انسان ہوں اور دُور کھڑا دیکھ رہا ہوں

سچائیاں انصاف کے نیزوں پہ ٹنگی ہیں
سنگین جرائم کو رِہا دیکھ رہا ہوں

ہیں مسندِ افکار پہ ذہنوں کے اپاہج
بیساکھیوں کو راہ نما دیکھ رہا ہوں

آنکھوں کو جھپکنے میں ہے صدیوں کا خسارہ
اُڑتے ہُوئے لمحوں کو ذرا دیکھ رہا ہوں

نوخیز بہاروں کی تباہی کا قصیدہ
سوکھی ہُوئی شاخوں پہ لکھا دیکھ رہا ہوں

نعرے ہیں اُجالوں کے زبانوں پہ مظفرؔ
سینوں سے دھواں اُٹھتا ہُوا دیکھ رہا ہوں

○

صحرا میں وہی ریت کی جھنکار وہی ہے
پیاسوں کو سرابوں سے سروکار وہی ہے

اسلوب انوکھا سہی آوازِ جرس کا
خود لغزشِ پا کہتی ہے رفتار وہی ہے

جو ڈر ہمیں کٹتے ہوئے ساحل کا اِدھر تھا
اُترے ہیں جب اُس پار تو اُس پار وہی ہے

پھرتی ہوئی آنکھیں ہیں بدلتے ہوئے چہرے
کھُل کر جو کرے بات پُراسرار وہی ہے

سُورج نکل آیا ہے اُجالے نہیں پھُوٹے
ماضی میں جو تھا صبح کا کردار وہی ہے

جاگے ہُوئے ذہنوں پہ ہے تخریب کی تہمت
چھینٹے ہیں وہی خون کے دیوار وہی ہے

جس پیڑ کے سائے میں تھکن دور ہو میری
سُوکھا ہی سہی وہ مجھے درکار وہی ہے

آئی نہ کوئی لہر مرے ہاتھ مظفرؔ
بہتے ہُوئے دریا سے مجھے پیار وہی ہے

○

لباسِ خاک پہن کر چمن میں آئے ہیں
مسافروں کی طرح ہم وطن میں آئے ہیں

ہماری روح کی آنکھیں بھی ہیں زبان بھی ہے
یہ اور بات کہ چھپ کر بدن میں آئے ہیں

ہمیں خبر ہے کہ ہم کیا ہیں اور جہاں کیا ہے
سیاہ رات کے جگنو ہیں، بن میں آئے ہیں

تلاشِ گُل کی مظفرؔ ملی ہے خوب سزا
اُلجھ کے خار، مرے پیرہن میں آئے ہیں

○

پکارا تھا تجھے تنہائیوں میں
نظر گم ہو گئی پرچھائیوں میں

تجھے دیکھوں میں اپنے زاویوں سے
چھُپا ہے تُو مری تنہائیوں میں

مری خوشبوئیں اپنے ساتھ رکھے
صبا خوش ہے مری رسوائیوں میں

سجیں لاشوں کی پیشانی پہ سہرے
اُڑائے جائیں دُکھ شہنائیوں میں

چُنے ساحل سے پتھر تُو نے، ورنہ
صدف تھے بحر کی گہرائیوں میں

○

رہے شکن کی طرح زندگی کے ماتھے پر
لبِ وفا پہ سسکتی ہُوئی دعا نہ بنے

چلے جو ہم تو کھِلے پھول ریگ زاروں میں
مزاج تو وہی پایا اگر صبا نہ بنے

گداز بن کے رہے مطرب کے سینے میں
زبان ساز سے نکلی ہُوئی صدا نہ بنے

مظفرؔ اپنے زمانے کا ہے وہ پیغمبر
جو صاف صاف کہے بات اور بُرا نہ بنے

○

بے خبر سا بھی ہوں احساس جنوں کا بھی نہیں
دھول بھی سر میں اُڑی ہے کوئی صحرا بھی نہیں

روشنی لے کے بہت دُور کھڑی ہے دُنیا
مجھ سے کہتی ہے ترے ساتھ تو سایا بھی نہیں

کر دیا شہر بدر اُس نے مری وحشت کو
جس کے دامن سے مرا ہاتھ شناسا بھی نہیں

دوسروں کے لیے ہر سانس مرا خرچ ہُوا
اپنے بارے میں مظفّرؔ کبھی سوچا بھی نہیں

○

رچی ہوئی تھی تہِ ذہن میں عجیب گھٹن
کھلی فضا تھی مگر سانس بھی لیا نہ گیا
کسی کے ہاتھ سے پتھر بھی کھا کے لب نہ ہلے
جو تم نے پھول بھی مارا تو چپ رہا نہ گیا
سفر کیے مجھے صدیاں گزر گئیں لیکن
رہِ وفا سے منظفرؔ نشان پا نہ گیا

○

وحشتِ دل بھی بے زبان ہوئی   کیا جواب سکوتِ صحرا دیں
تیز جھونکوں کی بارگاہوں میں   کر رہے ہیں چراغ فریادیں
تو نے شعلے دیے ہمیں دنیا   ہم تجھے پھول کیسے لوٹا دیں
ایک دیوانہ ایک سنگ بکف
آدمی کی ہیں دونوں ایجادیں

قطعات

○

ہے کہکشاں سی گزرگاہ دل سے آنکھوں تک
لہو کی آنچ سے ہیں تابناکیاں میری
وہ روشنی ہوں کہ سوئے کبھی نہ جس کا ضمیر
بجھے نہ جو، ہے وہ پتھر کی لَو زباں میری

○

زندگی کی قبا کا ہر ٹکڑا
وقت کے پیرہن میں ٹانکا ہے
اے زمانے ہمیں دعائیں دے
تیری عریانیوں کو ڈھانکا ہے

○

کہکشاں ہوں نہ ماہ و انجم ہوں
نہ خیالِ نشاط میں گم ہوں
دُکھ بھری کائنات کے لب پر
خوں میں ڈوبا ہُوا تبسم ہوں

○

آندھیوں کو کڑی سزا دوں گا
گرد کو آئنہ بنا دوں گا
گھُٹ کے مرنا پڑے مجھے چاہے
آپ کو میں کھُلی فضا دوں گا

○

اپنے سائے کو دوں اگر آواز
راہ کے پیچ و خم سے تو نکلے
پتّھروں سے اگر کلام کروں
پردۂ ہر صنم سے تو نکلے

○

سامنے کی اگر ہوا نہ چلے
اپنی رفتار کا پتا نہ چلے
میں بھی پھر ساتھ دوں زمانے کا
ساتھ میرے اگر زمانہ چلے

○

اے مصوّر ہمارے خواب چُرا
دیکھ تعبیر پھر زمانے کی
ہم کو پہلے نگاہ میں رکھ لے
کھینچ تصویر پھر زمانے کی

○

تیرگی کا طلسم توڑا ہے
شب کے ماتھے پہ ماہِ نو بن کر
رفتگاں کا لگا رہے ہیں سراغ
ہم زمانے کے پیش رو بن کر

○

ہم سے ہوتا ہے جب گناہ کوئی
اُس کو قسمت کی بھول کہتے ہیں
کتنے خود اعتماد ہیں ہم لوگ
لغزشوں کو اصول کہتے ہیں

○

آپ اگر زہر خند رکھتے ہیں

ہم بھی تریاق چند رکھتے ہیں

آپ اُونچے محل بنا لیجے

ہم نظر کی کمند رکھتے ہیں

○

کھا ہی جاتے ہیں ہم فریبِ سخن

احتراماً یقین کرتے ہیں

اس قدر خود بھی وہ حسین نہیں

بات جتنی حسین کرتے ہیں

○

آگ ایسی لگی ہے سینے میں
جس کو آنسو بجھا نہیں سکتے
شعلۂ دل اگر بھڑک اُٹھا
آپ دامن بچا نہیں سکتے

○

نہیں بھاتا ہمارا جینا اگر
تن تنہا خوشی سے جی لینا
زہر پہلے ہمیں عطا کر دو
پھر تم آبِ حیات پی لینا

○

کتنا شیریں سوال تھا میرا
کتنا روکھا جواب پایا ہے
چل کے میری کمان سے اک تیر
میرے سینے پہ لوٹ آیا ہے

○

میں جو دیکھوں دکھا نہیں سکتا
میری بینائیوں پہ پہرے ہیں
چھن گئے جو، وہ خواب کیا ہوں گے
آنکھ میں اشک بھی سنہرے ہیں

○

مسکرا مسکرا کے جانِ حیات
مبتلائے توقّعات نہ کر
ہم بڑے سادہ لوگ ہیں ہم سے
شاعرانہ تکلّفات نہ کر

○

دیکھ یوں اے نگاہِ دزدیدہ
جاگ اُٹھے آرزوئے خوابیدہ
گفتگو اور اس قدر محتاط
دوستی اور اتنی سنجیدہ

○

زندگی کھیل ہے جیالوں کا !
چشمۂ خوں ہے موجِ رنگ نہیں
دستِ ہمت کوئی دراز کرے
دامنِ کائنات تنگ نہیں

○

اتحاد و وفا کے پیغمبر
بٹ گئے مختلف قبیلوں میں
تشنگی کے الاؤ سلگا کر
بھر دیا ہے لہو سبیلوں میں

○

زندگی زندگی کی ہے محتاج
آدمی آدمی کا داتا ہے
اس قدر چھوٹ دی ہے بندوں کو
اب خدا پر بھی رحم آتا ہے

نئی طرز کے لکھنے والوں میں جدید غزل کا معیار مظفر وارثی کی غزل سے قائم ہوتا ہے اگر یہ شاعر نہ ہوتا تو نہ جانے یہ نئی نسل کا قافلہ کہاں کہاں اور کدھر کدھر بھٹکتا پھرتا -

غزل میں رومانیت - نفسیات - فلسفہ اور منظر نگاری یوں تو سبھی اچھے شاعروں میں ملتی ہے لیکن طریق اظہار - اسلوب بیان اور نئے پن کا خوبصورت انداز جو مظفر وارثی کے یہاں ملے گا وہ اس ھجوم شاعراں میں کسی کے یہاں نہیں ہے - میں پھر کہوں گا کہ اس دور کی غزل کا میعار مظفر کی شاعری سے ھی قائم ہوگا اور اس سے کم درجے کی شاعری شاعروں کو فنکاروں کی صف میں نہیں آنے دے گی -

احسان دانش

قتیل شفائی حالات کے سائے میں وجدان و شعور کے نئے زمزمے لے کر نکلا ہے اس کے سامنے بھرے دن اور گونگی راتیں ہیں ۔ جنہیں گاتی آہٹوں اور پھول برساتی مسکراہٹوں کی ضرورت ہے ۔ لیکن ان کالے دنوں اور پیلی راتوں کے حصے میں کیا آیا ۔

"آوازوں کے سائے"

قتیل شفائی کی شاعری اپنی کالے پیلے رنگوں میں سرخ انار کے سے ترش اور میٹھے ذائقے سموتی ہے ۔ وہ جھومتے ناچتے گناہ گاروں کی جان بھی ہے اور منہ سورتے ہوئے پاکبازوں کا ایمان بھی ۔ وہ ایک فرد کو ساتھ لے کر چلتی ہے تو بعد میں معاشرہ اس کے ساتھ ہو لیتا ہے وجدان و شعور کی اس شاعری کا لہجہ ایک ایسے نیکدل دیوتا کا لہجہ ہے جو محرومیاں اگلتی ہوئی اس دھرتی پر جسموں کی آسودگی روحوں کا اطمینان ۔ اور دماغوں کا سکون بانٹتا پھرتا ہے ۔

(مصور مشرق عبدالرحمان چغتائی کے پر وقار سرورق کے ساتھ)

پبلشر : نیو ایج پبلی کیشنز
رضا روڈ نمبر ۱۱ ۔ شاہ کمال کالونی ۔ لاہور